اپنا بنایا ہوا محاورہ ہے اور بہت خوب ہے۔

بہت سے اسم ایسے ہیں جن کے آخر میں چھوٹی "ہ" لگانے سے مذکّر کا مونّث بن جاتا ہے جیسے "جمیل" سے "جمیلہ"، "والد" سے "والدہ"۔ یہ قاعدہ عربی سے اردو میں آیا ہے اور عام طور پر انھیں الفاظ پر عمل میں آتا ہے جو "جمیل" اور "والد" کی طرح ہیں۔ مثلاً "حمید"، "شاہد"، "شاعر"، "کامل" وغیرہ۔

مشق اور مطالعہ

(1) آپس میں گفتگو کرتے وقت ہمیں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

(2) مہذّب آدمی کسے کہتے ہیں اور وہ اپنی رائے کے اختلاف کو کسی مجلس میں کس طرح ظاہر کرتا ہے؟

(3) بحث و مباحثہ ایک حد تک کیوں ضروری ہے؟

محمّد حُسین آزاد

(1829 — 1910)

محمّد حسین آزاد دِلّی کے رہنے والے تھے۔ 1857 کے ہنگامے میں انگریزوں نے آزاد کے باپ کو پھانسی چڑھادیا۔ محمّد حسین آزاد اپنا سارا سامان اور خاندان چھوڑ کر برسوں مارے مارے پھرے۔ آخرکار 1864 میں وہ لاہور میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ یہاں انھیں بعض انگریز افسروں سے ملنے کا موقع ملا جنھوں نے اردو زبان میں نئی طرح کی نظم اور نثر کی بنیاد ڈالنے میں بڑا حصّہ لیا۔ مولانا حالی بھی ان کے شریک ہوئے۔ ایک نئی طرح کے مشاعرے کی بنیاد رکھی گئی جس میں غزلوں کے مصرعۂ طرح کے بجائے نظموں کے عنوان مقرر کیے جاتے تھے۔ انگریزی کتابوں کی طرز پر کتابیں بھی لکھی جانے لگیں۔ ان میں آزاد کی "نیرنگِ خیال" (1880) بہت اہم ہے۔

محمّد حسین آزاد نے 1881 میں "آبِ حیات" نام کی کتاب لکھی۔ اس کتاب میں اردو زبان اور شاعری کی تاریخ مفصّل طور پر اور نئے ڈھنگ سے بیان ہوئی ہے۔ اپنے طرزِ ادا، واقعات کی دلچسپی اور مثالوں کی کثرت کی بنا پر یہ بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔ "آبِ حیات" کی طرز پر انھوں نے فارسی زبان و ادب پر بھی ایک کتاب "سخن دانِ پارس" لکھی لیکن یہ "آبِ حیات" کے

مقابلے میں اتنی کامیاب نہیں۔ آزاد کی دوسری کتابوں میں "نصیحت کا کرن پھول" (جو بچوں اور عورتوں کے لیے لکھی گئی تھی) اور "دربارِ اکبری" قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے اردو اور فارسی کے چھوٹے درجوں میں پڑھائے جانے کے لیے نہایت عمدہ درسی کتابیں بھی لکھیں۔

محمد حسین آزاد بلاشبہ اردو کے سب سے بڑے نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریر بہ ظاہر سادہ لیکن دراصل بہت سجائی اور بنائی ہوتی ہے۔ کردار اور واقعہ دونوں کو چند لفظوں میں بالکل زندہ کر کے آنکھوں کے سامنے پیش کر دینا محمد حسین آزاد کی نثر کا ادنیٰ کمال ہے۔ "آبِ حیات" میں جتنے قصّے، واقعات اور لطیفے درج ہیں اور شاعروں کے بارے میں جو جو خاص باتیں کہی گئی ہیں وہ سب آج تک لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ "آبِ حیات" کی بہت سی باتوں کو غلط بھی کہا گیا ہے۔ بعد میں مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے ایک کتاب لکھ کر یہ بھی دکھایا ہے کہ "آبِ حیات" میں لکھی ہوئی وہ باتیں جن کو لوگ غلط سمجھتے ہیں دراصل غلط نہیں ہیں۔ لیکن غلط یا صحیح، آزاد کے قلم سے جو نکل گیا وہ ایسا اَمِٹ ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اپنی تنقید کی پوری پوری دیواریں اسی پر کھڑی کی ہیں۔

"آبِ حیات" کے جو اقتباسات ہم نے آپ کے سامنے رکھے ہیں، ان میں مرزا مظہر جانِ جاناں (1698-1781)، سیّد محمد میر سوزؔ (1720 — 1798) اور یحییٰ مان جرأتؔ (1748-1809) کے حالات ہیں۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ تینوں شاعروں کی شخصیت کس طرح بالکل الگ الگ ہمارے سامنے آتی ہے۔

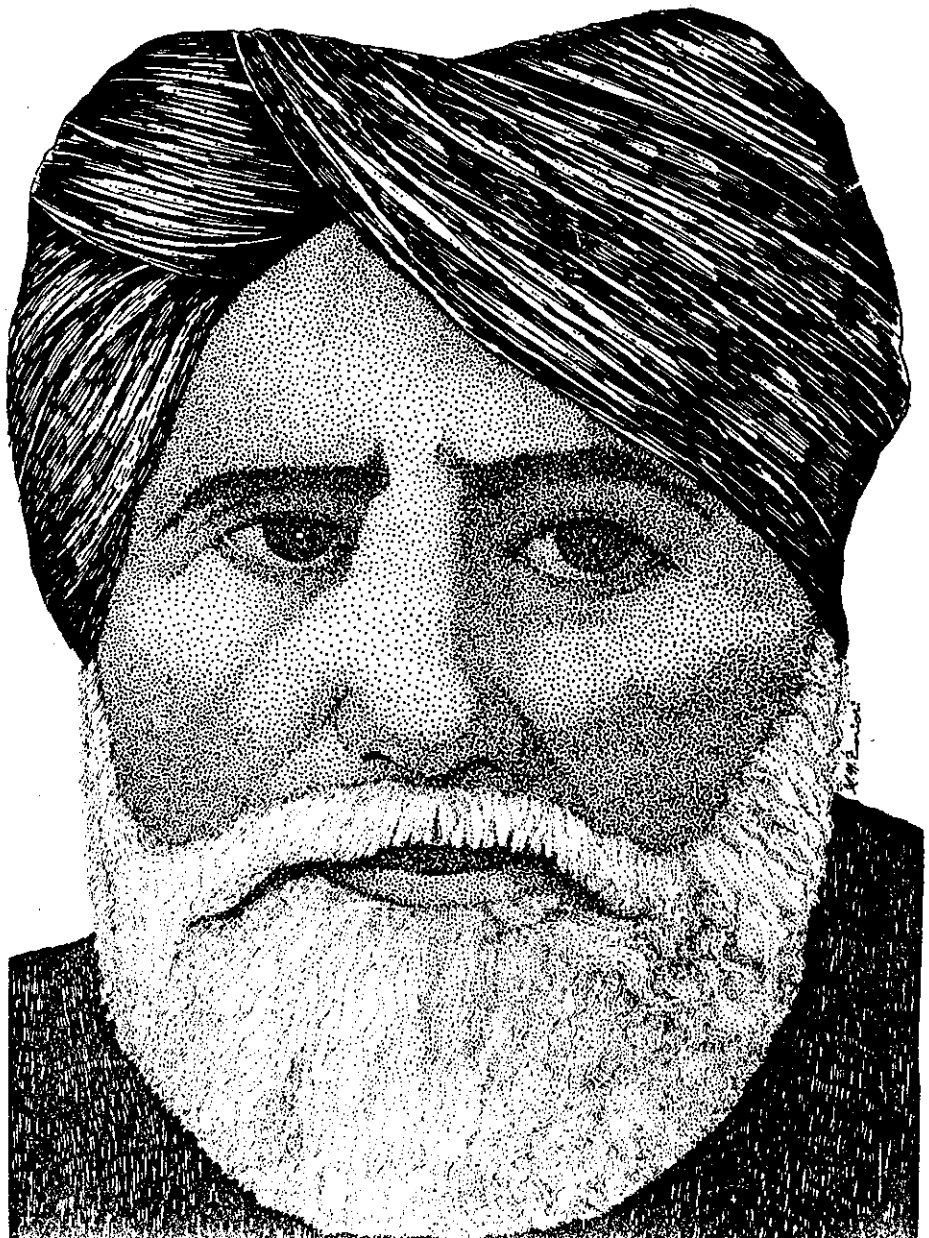

مرزا مظہر جان جاناں

مرزا مظہر جان جاناں کے والد عالمگیر کے دربار میں صاحبِ منصب تھے۔ نسب ان کا باپ کی طرف سے محمدؐ ابنِ حنفیہؓ سے ملتا ہے جو کہ حضرت علیؓ کے بیٹے تھے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربارِ شاہی میں صاحبِ منصب تھے۔ دادی اسدخاں وزیرِ عالمگیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پردادا سے اکبر بادشاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسہ تھے۔ 1111ھ میں جب کہ عالمگیر دکن پر فوج لیے پڑا تھا۔ ان کے والد نوکری چھوڑ کر دلّی کو پھرے۔ یہ کالا باغ علاقہ مالوہ میں 11 رمضان کو جُمعہ کے دن پیدا ہوئے۔ عالمگیر کو خبر گزری۔ آئینِ سلطنت تھا کہ اُمرا کے ہاں اولاد ہو تو حضور میں عرض کریں۔ بادشاہ خود نام رکھیں یا پیش کیے ہوئے ناموں میں سے پسند کر دیں۔ کسی کو خود بھی بیٹا یا بیٹی کر لیتے تھے کہ یہ امور طرفین کے دِلوں میں اتّحاد اور محبّت پیدا کرتے تھے، ان کے لیے ایک وقت پر سندِ ترقی ہوتے تھے۔ اور بادشاہوں کو ان سے وفاداری اور جاں نثاری کی امّیدیں ہوتی تھیں۔ شادی بھی اجازت سے ہوتی تھی۔ کبھی ماں باپ کی تجویز کو پسند کرتے تھے، کبھی خود تجویز کر دیتے تھے۔ غرض عالمگیر نے کہا کہ بیٹا باپ کی

جان ہوتا ہے۔ باپ مرزا جان ہے۔ اس کا نام ہم نے جان جاناں رکھا۔ پھر اگرچہ باپ نے شمس الدّین نام رکھا مگر عالمگیری نام کے سامنے نہ چمکا۔ مظہر تخلّص انھوں نے آپ کیا کہ جان جاناں کے ساتھ مشہور چلا آتا ہے۔ مرزا جان بھی شاعر تھے اور جانؔی تخلّص کرتے تھے۔

16 برس کی عمر تھی کہ باپ مر گئے۔ اسی وقت سے مُشتِ خاک کو بزرگوں کے گوشۂ دامن میں باندھ دیا۔ 30 برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں میں جھاڑو دی اور جو دن بہارِ زندگی کے پھول ہوتے ہیں انھیں بزرگوں کے روضوں پر چڑھا دیا۔ اس عہد میں تصوّف کے خیالات اَبر کی طرح ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ قطع نظر کمالِ شاعری کے ہزارہا مسلمان بلکہ ہندو بھی ان کے مرید تھے اور دل سے اعتقاد رکھتے تھے۔

مرزا صاحب کی تحصیلِ علمی عالمانہ نہ تھی مگر علمِ حدیث کو بااصول پڑھا تھا۔ حنفی مذہب کے ساتھ نقش بندی طریقے کے پابند تھے۔ اور احکامِ شریعت کو صدقِ دل سے ادا کرتے تھے۔ اوضاع و اطوار اور ادب آداب نہایت سنجیدہ اور برجستہ تھے کہ جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا تھا ہُشیار ہو کر بیٹھتا تھا۔ لطافتِ مزاج اور سلامتیِ طبع کی نقلیں ایسی ہیں کہ آج سُن کر تعجّب آتا ہے۔ خلافِ وضع اور بے اسلوب حالت کو دیکھ نہ سکتے تھے۔

نقل ایک دن درزی ٹوپی سی کر لایا۔ اُس کی تراش ٹیڑھی تھی۔ اس وقت دوسری ٹوپی موجود نہ تھی، اس لیے اسی کو پہننا پڑا۔ مگر سر میں درد ہونے لگا۔

نقل جس چارپائی میں کان ہو اس پر بیٹھا نہ جاتا تھا، گھبرا کر اُٹھ کھڑے

ہوتے تھے۔ چنانچہ دلّی دروازہ کے پاس ایک دن ہُوا دار میں سوار چلے جارہے تھے۔ راہ میں ایک بنیے کی چارپائی کے کان پر نظر جا پڑی۔ وہیں ٹھیر گئے اور جب تک اس کا کان نہ نکلوالیا آگے نہ بڑھے۔

نقل ایک دن ایک نواب صاحب کہ ان کے خاندان کے مرید تھے، ملاقات کو آئے اور خود صُراحی لے کر پانی پیا۔ اتفاقاً آب خورہ جو رکھا تو ٹیڑھا رکھا۔ مرزا کا مزاج اس قدر برہم ہوا کہ ہرگز ضبط نہ ہوسکا اور بگڑ کر کہا کہ عجب بے وقوف احمق تھا جس نے تمھیں نواب بنادیا، آب خورہ بھی صراحی پر رکھنا نہیں آتا۔

نقل ایک معتقد کا بیٹا حسنِ اعتقاد سے غزل لے کر آیا کہ شاگرد ہو اور اصلاح لے۔ انھوں نے کہا کہ اصلاح کے ہوش و حواس کسے ہیں۔ اب عالم کچھ اور ہے۔ عرض کی کہ میں فقط بطورِ تبرّک سعادت حاصل کرنی چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ اس وقت ایک شعر خیال میں آیا ہے، اسی کو تبرّک اور اسی کو اصلاح سمجھ لو ؎

لوگ کہتے ہیں مَر گیا مظہر
فی الحقیقت مَیں گھر گیا مظہر

غرض ساتویں محرّم کی تھی کہ رات کے وقت ایک شخص مٹھائی کی ٹوکری ہاتھ میں لیے آیا، دروازہ بند تھا۔ آواز دی اور ظاہر کیا کہ میں مرید ہوں۔ نذر لے کر آیا ہوں۔ وہ باہر نکلے تو ایک قرابین[1] ماری کہ گولی سینے کے پار ہوگئی۔

---

[1] استاد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ دُگاڑے کا نشان ہم نے بھی دیکھا ہوا ہے۔ کیول رام کے کوٹھے پر ڈیوڑھی کی دیوار میں اب تک موجود تھا۔

وہ تو بھاگ گیا۔ مگر انھیں زخم کاری آیا۔ تین دن تک زندہ رہے، اس عالمِ اضطراب میں لوٹتے تھے اور اپنا ہی شعر پڑھتے تھے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کُند ایں عاشقان پاک طینت را

یہ تین دن نہایت استقلال اور ثابت قدمی سے گزارے بلکہ جب شاہ عالم بادشاہ کو خبر پہنچی تو بعد تحقیقات کے کہلا بھیجا کہ قاتل نہیں ملتا۔ نشان دو تو ہم اُسے سزا دیں۔ جواب میں کہا کہ فقیر کشتۂ راہِ خدا ہیں اور مُردہ کا مارنا قتل نہیں۔ قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں۔ یہاں بھیج دیں۔ آخر دسویں کو شام کے وقت دنیا سے انتقال کیا۔ بہت لوگوں نے تاریخیں کہیں۔ مگر درجہ اوّل پر میر قمرالدّین منّت کی تاریخ ہے، جس کا مادّہ خاص الفاظ حدیث ہیں اور اتّفاق یہ کہ موزوں ہیں ؎

عَاشَ حَمِیْدًا، مَاتَ شَہِیْدًا

سیّد محمّد میر سوز

میر موصوف سوارکاری میں شہسوار اور فنونِ سپاہ گری میں ماہر۔ خصوصاً تیر اندازی میں قدر انداز تھے۔ ورزش کرتے تھے اور طاقتِ خداداد بھی اس قدر تھی کہ ہر ایک شخص ان کی کمان کو چڑھا نہ سکتا تھا۔ غرض کہ 1213 ہجری میں شہر لکھنؤ میں 78 برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کے بیٹے بھی شاعر تھے اور باپ کے تخلّص کی رعایت سے داغ تخلّص کرتے تھے۔ جوانی میں اپنے مرنے کا داغ دیا اور اس سے زیادہ افسوس یہ کہ کوئی غزل ان کی دستیاب نہ ہوئی۔ خود حسین تھے اور حسینوں کے دیکھنے والے تھے۔ آخر غمِ فراق میں جان دی۔

میر سوز مرحوم کی زبان عجب میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے چنانچہ غزلیں خود ہی کہے دیتی ہیں۔ ان کی انشا پردازی کا حُسن، تکلّف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک ہے۔ اس خوشنمائی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کٹورا سا دھرا ہے اور سبز سبز پتّوں میں اپنا اصلی جوبن دکھا رہا ہے۔ جن اہلِ نظر کو خدا نے نظر باز آنکھیں دی ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک حُسنِ خُداداد کے سامنے ہزاروں بناوٹ کے بناؤ سنگار قربان ہوا کرتے ہیں۔ البتہ غزل میں دو تین شعر کے بعد ایک آدھ پرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے۔ خیر اس سے قطع نظر کرنی چاہیے۔ ع

فکرِ معقول بفرما گُلِ بے خار کجاست

"غزل" لغت میں عورتوں سے باتیں چپتیں ہیں۔ اور اصطلاح میں یہ ہے کہ عاشق اپنے معشوق کے ہجر یا وصل کے خیالات کو وسعت دے کر اس کے بیان سے دل کے ارمان یا غم کا بُخار نکالے اور زبان بھی وہ ہو کہ گویا دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ بس وہ کلام ان کا ہے۔ معشوق کو بجائے 'جاناں' کے فقط 'جان' یا 'میاں جان' کہہ کر خطاب کرنا ان کا خاص محاورہ ہے۔

"مجالسِ رنگین" کی بعض مجلسوں سے اور ہمارے عہد سے پہلے کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام صفائیِ محاورہ اور لُطفِ زبان کے باب میں ہمیشہ سے ضربُ المثل ہے۔ ان کے شعر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی چاہنے والا اپنے چاہیتے عزیز سے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ وہ اپنی محبّت کی باتوں کو اس طرح شعر میں باندھتے تھے کہ شعر کی موزونیت کے لیے لفظوں کا آگے پیچھے کرنا بھی گوارا نہ سمجھتے تھے۔ میر تقی کہیں کہیں ان کے قریب آجاتے ہیں۔ پھر بھی بہت فرق ہے۔ وہ بھی محاورہ خوب باندھتے تھے مگر فارسی کو بہت نباہتے تھے اور مضامین بلند لاتے تھے۔ سوداؔ بہت دور ہیں کیونکہ مضامین کو تشبیہ و اِستعارہ کے رنگ میں غوطے دے کر محاورہ میں ترکیب دیتے تھے اور اپنے زورِ شاعری سے لفظوں کو پس و پیش کر کے اس بندوبست کے ساتھ جڑتے تھے کہ لُطف اس کا دیکھے ہی سے معلوم ہوتا ہے۔

میر سوز جیسے سیدھے سیدھے مضمون باندھتے تھے، ویسے ہی آسان آسان طرحیں بھی لیتے تھے۔ بلکہ اکثر ردیف کو چھوڑ کر قافیہ ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ ان کے شعر کا قوام فقط محاورہ کی چاشنی پر ہے۔ اِضافت، تشبیہ، اِستعارہ، فارسی ترکیبیں ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔ ان لحاظوں سے انھیں گویا اردو غزل کا شیخ سعدی کہنا چاہیے۔

شیخ قلندر بخش (یحییٰ مان) جرأت

جرأت کی طبیعت غزل کے لیے عین مناسب واقع ہوئی تھی۔ حریف، ظریف، خوش طبع، عاشق مزاج تھے۔ البتہ استعدادِ علمی اور کاوشِ فکری شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ ان کی طبیعت بجائے محنت پسند ہونے کے عشرت پسند تھی۔ تعجّب یہ ہے کہ زمانہ نے شکر خورے کو شکر دے کر تمام عمر قدر دان اور ناز بردار امیروں میں بسر کردی جہاں رات دن اس کے سوا اور چرچا ہی نہ تھا۔ اگر ان کی طبیعت میں یہ باتیں نہ ہوتیں اور وہ استعدادِ علمی سے طبیعت میں زور اور فکر میں قوّتِ غور پیدا کرتے تو اتنا ضرور ہے کہ اصنافِ سخن پر قادر ہوجاتے مگر پھر یہ لُطف اور شوخیاں کہاں۔ بلبل میں شوریدہ مزاجی نہ ہوتی تو یہ چہچہے کب ہوتے۔ نہیں گلہائے بہاری تمھاری ہَوا پر، ہوتے تو فصلِ بہار کے مزے کب ہوتے۔ بات یہ ہے کہ طبیعت میں تیزی اور طرّاری تھی مگر نزلے کا زور اور طرف جا گرا تھا۔ یہی سبب ہے کہ کلام میں بلند پروازی، لفظوں میں شان و شکوہ اور معنوں میں دقّت نہیں جس نے قصیدہ تک نہ پہنچنے دیا اور غزل کے کوچہ میں لاڈالا۔ اس عالم میں جو جو باتیں ان پر اور ان کے دل پر گزرتی تھیں سو کہہ دیتے تھے۔ مگر ایسی کہتے تھے کہ اب تک دل پھڑک اٹھتے ہیں۔ مشاعرے میں غزل پڑھتے

تھے تو جلسے کے جلسے لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ سیّد انشا باہمہ فضل و کمال رنگا رنگ کے بہروپ بدل کر مشاعرے میں دھوم دھام کرتے تھے۔ وہ شخص فقط اپنی سیدھی سادی غزل میں وہ بات حاصل کرلیتا تھا۔

مرزا محمّد تقی خاں ترقّی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور تمام امرائے نامی و شعرائے گرامی جمع ہوتے تھے۔ میر تقی مرحوم بھی آتے تھے۔ ایک دفعہ جرأت نے غزل پڑھی۔ اور غزل بھی وہ ہوئی کہ تعریفوں کے غُل سے شعر تک سُنائی نہ دیے۔ میاں جرأت یا تو اس جوش و سرور میں جو کہ اس حالت میں انسان کو سرشار کر دیتا ہے۔ یا شوخیِ مزاج سے میر صاحب کے چھیڑنے کے ارادے سے ایک شاگرد کا ہاتھ پکڑ کے ان کے پاس آکر بیٹھے اور کہا کہ حضرت! اگرچہ آپ کے سامنے غزل پڑھنی بے ادبی اور بے حیائی ہے مگر خیر اس بیہودہ گو نے جو یاوہ گوئی کی آپ نے سماعت فرمائی؟ میر صاحب تیوری چڑھا کر چُپکے ہو رہے۔ جرأت نے پھر کہا۔ میر صاحب کچھ ہوں ہاں کر کے پھر ٹال گئے۔ جب انھوں نے بہ تکرار کہا تو میر صاحب نے جو الفاظ فرمائے وہ یہ ہیں:

کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو اپنی چوٹا چاٹ کہ لیا کرو۔

میر صاحب مرحوم شاعروں کے ابوالآبا تھے۔ کیسے ہی الفاظ میں فرمائیں مگر جوہری کامل تھے۔ جواہر کو خوب پرکھا۔ اس میں کچھ شُبہ نہیں کہ عاشق و معشوق کے راز و نیاز اور حسن و عشق کے معاملوں کو جس شوخی اور چوچلے سے انھوں نے برتا ہے وہ انھیں کا حصّہ تھا۔ آج تک دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔

معنی اوراشارے

سَنَدِ ترقّی = ترقّی کی دستاویز یا پروانہ

نقش بندی طریقہ = صوفیوں کے چار مشہور طریقے یا سلسلے ہیں: قادری، سہروردی، چشتی اور نقش بندی۔ ہندوستان میں نقش بندی طریقے کے سب سے بڑے بزرگ شیخ احمد سرہندی کہے جاتے ہیں۔ مرزا مظہر جانِ جاناں تین واسطوں سے شیخ سرہندی کے مرید تھے۔

اوضاع = طریقے۔ یہ "وضع" کی جمع ہے۔

نقلیں = واقعات

چارپائی کا کان = چارپائی کی پٹّی کا وہ حصّہ جو پائے کے باہر نکل آئے۔ چارپائی کا ٹیڑھا ہونا یا چار کونوں کا برابر نہ ہونا۔

ہوادار = پالکی کی طرح کی ایک سواری جو چاروں طرف سے کھلی ہوتی ہے۔

قرابین = ولایتی بندوق جو رائفل کی پہلی شکل تھی۔ اس کو انگریزی میں Carbine کہتے ہیں۔

اُستاد مرحوم = محمّد حُسین آزاد کے استاد شیخ ابراہیم ذوق

دُگاڑہ = دونالی بندوق

"بنا کردند خوش رسمے ...

... پاک طینت را" = خُدا ان پاک طبیعت والے عاشقوں پر رحمت کرے انھوں نے خون اور خاک میں لوٹنے اور لتھڑنے کی رسم

اچھّی قائم کی۔

تاریخ کہنا = کوئی لفظ یا عبارت ایسی بنانا جس کے حرفوں کی گنتیاں جوڑی جائیں تو تاریخ نکل آئے۔ حرفوں کی گنتیاں مقرّر ہیں جو حسب ذیل ہیں:

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی
1	2	3	4	5	6	7	8	9	10

ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص
20	30	40	50	60	70	80	90

ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ
100	200	300	400	500	600	700

ض	ظ	غ
800	900	1000

حرفوں کی اس ترتیب کو "اَبْجَدْ۔ ہَوَّز۔ حُطّی۔ کَلَمَن سَعْفَص۔ قَرَشَت۔ ثَخَّذ۔ ضَظَّغ" کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے اور گنتی کے اس طریقے کو "قاعدۂ ابجد" یا "طریقۂ جُمَل" کہتے ہیں۔ پ، ٹ، چ، ڈ، ڑ، ژ، گ عربی میں نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کی گنتیاں ان کے قریب ترین عربی حروف کے اعتبار سے حسب ذیل مقرّر کردی گئی ہیں: پ (2) ٹ (400) چ (3) ڑ (200) ژ (7) گ (20)۔ ہمزہ گنتی میں نہیں آتا۔

مادّہ = وہ لفظ یا فقرہ جس سے تاریخ نکلتی ہے۔ چونکہ اس پوری نظم یا شعر کو بھی "تاریخ" کہتے ہیں جس میں تاریخ والا فقرہ یا لفظ نظم کہا جاتا ہے اس لیے خاص تاریخ کی گنتی رکھنے والے لفظ یا فقرے کو "مادّہ" یا "مادّۂ تاریخ" کہتے ہیں۔

عَاشَ حَمِیْدًا
مَاتَ شَہِیْدًا = یہ عربی کے فقرے ہیں، معنی ہیں: وہ زندہ تھا تو لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔ وہ مرا تو شہادت کے درجے میں مرا۔

کمان چڑھانا = کمان کو جھکا کر اس پر وہ تار چڑھانا جس کے ذریعے تیر پھینکتے ہیں۔ یہاں اس سے یہ بھی مراد ہے کہ ہر شخص میر سوز کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔

فکرِ معقول بفرما گُلِ بے خار کُجاست = سوچ سمجھ کر خیال کرو ایسا کوئی پھول کہاں ہے جس میں کانٹا نہ ہو۔

مجالسِ رنگین = سیّد محمّد میر سوز کے زمانے کے مشہور شاعر سعادت یار خاں رنگین کی ایک کتاب کا نام۔

آسان طرحیں لینا = ایسی طرحیں اختیار کرنا جو آسان ہوں۔ "طرح" سے یہاں مراد ہے ردیف اور قافیہ۔ کسی مصرعے کو سامنے رکھ کر اس ردیف و قافیہ میں شعر کہے جائیں تو

اس مصرعے کو بھی "طرح" یا "مصرعِ طرح" کہتے ہیں۔

قِوام = بنیاد۔ وہ چیز جس کے ذریعے کسی کھانے پینے کی چیز کا ذائقہ یا مزہ قائم ہوتا ہے۔

شکر خورہ = چھوٹی سی ایک خوب صورت چڑیا جو پھولوں کا رس پیتی ہے۔ اسی اعتبار سے محاورہ ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔ یعنی خدا ہر شخص کو وہ سامان دیتا ہے جس کی اُسے ضرورت ہو۔

نزلے کا زور = فارسی کی کہاوت ہے کہ "نزلہ بر عضوِ ضعیف"۔ یعنی نزلہ جسم کے اسی حصّے پر گرتا ہے (یعنی اثر کرتا ہے) جو کمزور ہو۔ مراد یہ ہے کہ کمزوروں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ آزاد یہاں یہ کہہ رہے ہیں کہ جرأت نے اپنی طبیعت کی تیزی اور طرّاری قصیدے کے بجائے غزل میں ظاہر کی کیونکہ قصیدے کے مقابلے میں غزل آسان ہوتی ہے۔

بیہودہ گو = بے فائدہ باتیں کرنے والا

یاوہ گوئی = بکواس

ابوالآبا = یہ عربی ہے۔ معنی ہیں باپوں کا باپ۔ لہٰذا مراد ہوئی سب سے اوّل مرتبہ رکھنے والا۔

غور کرنے کی بات

مندرجہ ذیل فقروں پر غور کیجیے :

(1) شمس الدّین نام رکھا مگر عالمگیری نام کے سامنے نہ چمکا۔

(2) مشتِ خاک کو بزرگوں کے گوشۂ دامن میں باندھ دیا۔

(3) جو دن بہارِ زندگی کے پھول ہوتے ہیں انھیں بزرگوں کے روضوں پر چڑھا دیا۔

پہلے فقرے میں شمس الدّین کے اعتبار سے "چمکا" کس قدر خوب صورت ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے رکھّے ہوئے نام کو "عالم گیری نام" کہہ کر گویا یہ بھی اشارہ کر دیا کہ یہ نام تمام دنیا پر چھا جانے والا ثابت ہوا۔

"مشتِ خاک" کے معنی ہیں مٹّھی بھر مٹّی۔ اس اعتبار سے گوشۂ دامن میں باندھنا بہت خوب ہے۔ انسان کو یا انسان کے بدن کو مشتِ خاک کہتے ہیں۔ لہٰذا مراد یہ ہوئی کہ مرزا صاحب نے اپنے کو بزرگوں کی خدمت کے حوالے کر دیا۔

تیسرے فقرے میں نوجوانی کو "بہارِ زندگی" اور نوجوانی کے دنوں کو "پھول" کہنا نہایت عمدہ ہے۔ "روضہ" کے ایک معنی "باغ" بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے بزرگوں کے مزارات پر نوجوانی کے دن گزارنا اور بھی عمدہ بات ہے۔ یہ بھی خیال میں رکھیے کہ مزاروں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔

محمّد حسین آزاد کی تحریریں اس قسم کے خوب صورت فقروں سے بھری ہوئی ہیں۔ آپ بھی ایسے تین فقرے منتخب کیجیے اور اپنی کاپی میں لکھیے۔

" شعر تو تم کہہ نہیں جانتے ہو۔" "آنا"، "جاننا" وغیرہ کے ساتھ ایسے فقرے آج کل کم بولے جاتے ہیں۔ "نہیں پانا" کے ساتھ والے فقرے البتّہ اب

بھی رائج ہیں۔ ایسے پانچ فقرے بنائیے۔

مشق اور مطالعہ

(1) مرزا مظہر جان جاناں، میر سوز اور جرأت میں سے سب سے اچھا بیان آپ کے خیال میں کون سا ہے، اور کیوں؟ پندرہ جملوں میں لکھیے۔

(2) محمّد حسین آزاد اور غالب کے اندازِ نثر کا مقابلہ پندرہ جملوں میں لکھیے۔